POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 August 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 23-08-2026 • Price: 5/- • 1-7 September 2026 • Issue: 33 • Vol:85

یکم تا ۷ ستمبر ۲۰۲۶ء • شمارہ:۳۳ • جلد:۸۵

صحتِ زباں (۴۹)

رؤف پاریکھ

بُز، بُزدار، بُزدِل اور بُزِ اَخفَش

کسی زمانے میں عربی نحو کا ایک عالم گزرا تھا جس کا نام اَخفَش تھا۔ سچ یا جھوٹ خدا معلوم، لیکن مشہور ہے کہ اخفش جب طالبِ علم تھا تو اس کے پاس ایک بکری تھی اور وہ نحو کا سبق یاد کر کے اسے اپنی بکری کے سامنے پڑھتا، اگر بکری سر ہلا دیتی تو وہ مان لیتا کہ سبق درست یاد ہو گیا ہے۔ ایک دن بکری کو جب کاٹا گیا اور اس کی سری بنائی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی کھوپڑی خالی تھی اور اس میں بھیجا نہیں تھا۔ اس دن سے بُزِ اَخفَش (یعنی اخفش کی بکری) کی ترکیب زبان زدِ خاص وعام ہوگئی اور جس کی کھوپڑی خالی ہو، جو بے وقوف ہو، اسے 'بزِ اخفش' کہنے لگے[1]۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اخفش نے علمِ عروض ایجاد کیا تھا اور وہ ہر نئی بحر بنانے کے بعد اسے بکری کے سامنے تصدیق وتائید کے لیے پڑھتا تھا۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی یہ قصہ درج ہے لیکن اس میں بحروں کا نہیں بلکہ بکری کے سامنے سبق یاد کرنے کا ذکر ہے[2]۔ یہ بات بہرحال مشہور ہوگئی اور جو سمجھے بوجھے بغیر ہاں میں ہاں ملائے، وہ جس کا دماغ خالی ہو، یعنی احمق ہو اسے بُزِ اَخفش کہنے لگے۔ یہ قصہ خدا جانے کہاں تک سچ ہے، البتہ بُزِ اَخفش کا مفہوم (یعنی بے سمجھے ہاں میں ہاں ملانے والا یا مغز سے تہی) اپنی جگہ درست ہے اور اس مفہوم میں یہ ترکیب مستعمل رہی ہے۔

یہ قصہ یوں یاد آیا کہ ایک طالبِ علم نے فون کر کے پوچھا کہ بُزِ اَخفش کا کیا مطلب ہے؟ یہ سوال اساتذہ کے انتخاب کی غرض سے لیے گئے ایک تحریری امتحان میں پوچھا گیا تھا جس میں وہ طالبِ علم شریک ہوا تھا۔ لیکن وہ بے چارہ اس ترکیب کو سمجھ ہی نہ سکا تھا اور 'بُز' اور 'اخفش' کو الگ الگ پڑھنے کے بجائے بز کو الف سے ملا کر پڑھ رہا تھا، یعنی 'بُزا' کو الگ اور 'خفش' کو الگ۔ اسے بتایا کہ اس ترکیب کا درست تلفظ بُزِ اَخفش ہے، 'بُز' الگ اور 'اَخفَش' الگ، بُز کا مطلب ہے بکری اور اخفش ایک عالم کا نام ہے۔ بُزِ اخفش کے لفظی معنی ہیں اخفش کی بکری اور مرادی معنی ہیں بغیر سمجھے تائید کرنے والا۔ پھر اسے اخفش اور اس کی بکری کا قصہ سنایا۔

محمود نیازی نے اپنی کتاب میں 'بزِ اخفش' کے اندراج کے ساتھ انشاء اللہ خاں انشاء کا ایک شعر بھی دیا ہے لیکن اس کا متن درست نہیں (اور اسی لیے بے وزن بھی ہوگیا ہے)[3]۔ انشاء کے شعر کا درست متن یہ ہے:

بڑی پھرتی ہے کھڑ گنجی سی اک لونڈی جو واعظ کی
بزِ اخفش بنائے اپنی صورت خاک ساری میں[4]

اردو لغت بورڈ نے اپنی لغت (جلد دوم) میں 'بزِ اخفش' کا اندراج شامل کیا ہے[5] لیکن قدیم سند کے طور پر بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر دیا ہے، جب کہ انشاء کا منقولۂ بالا شعر اس کی قدیم ترسند ہے۔

بُز فارسی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے بکری یا بکرا[6]۔ اس لفظ کو ملا کر بعض دیگر تراکیب بھی اردو میں رائج ہیں، مثلاً بُزدل۔ بُزدل وہ ہے جس کا دل بُز یعنی بکری جیسا ہو، یعنی جو بکری کی طرح فوراً ڈر جائے۔ اسی لیے ڈرپوک کے مفہوم میں بزدل مستعمل ہے۔ اور جو بہادر ہو اسے شیر دل کہتے ہیں۔ بُزدار میں بھی یہی بُز ہے، مراد ہے بکریوں والا، وہ جس کے پاس بکریاں ہوں۔ بز کا لفظ بُزکشی کی ترکیب میں بھی موجود ہے۔ بزکشی ایک کھیل ہے جو میدان میں کھیلا جاتا ہے اور جس میں گھڑ سوار کھلاڑی بکری کو کھینچ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہاڑی بکرے کو بُزِ کوہی کہتے ہیں، کوہ یعنی پہاڑ، کوہی یعنی پہاڑ سے متعلق یا پہاڑ کا، پہاڑی۔

چلتے چلتے اَخفَش کے لفظی معنی کو بھی دیکھ لیں۔ یہ عربی کا لفظ ہے اور اس کا مفہوم ہے: چھوٹی آنکھوں والا، چندھیائی آنکھوں والا، کمزور بصارت کا حامل شخص۔ نیز شَپَّرہ چشم یعنی چمگادڑ کی سی آنکھوں والا، جو روشنی میں دیکھ نہ سکے، جس کی پلکیں نہ ہوں اسے بھی اخفش کہتے ہیں[7]۔ فارسی میں شَپَّرہ (ش مفتوح، پ مشدد بفتحہ) چمگادڑ کو کہتے ہیں (شپرہ دراصل 'شب' اور 'پرہ' کا اِدغام ہے)۔ عربی میں چمگادڑ کو خُفّاش کہتے ہیں اور خِفش کے معنی عربی میں ہیں کمزور ہونا یا کمزور بصارت والا ہونا یا چھوٹی آنکھوں والا ہونا، رتوندا ہونا[8] (رتوندا/رتوندھا یعنی جسے رات کے وقت یا اندھیرے میں سجھائی نہ دے)۔ اسی سے اخفش ہے۔ لیکن اخفش کسی ایک شخص کا نام نہیں تھا اور کئی نحوی اس عرفیت سے مشہور ہوئے۔ اخفش نامی ان نحویوں کی فہرست علامہ سیوطی نے مرتب کی تھی اور ان میں تین زیادہ معروف ہوئے جنھیں اَلاَخفَشُ الاَکبر، اَلاَخفَشُ الاَوسط اور اَلاَخفَشُ الاَصغر کہا جاتا ہے[9]۔

عناصرِ اربعہ، عناصرِ خمسہ

طالبِ علموں کا ذکر آیا تو ایک اور طالبِ علم یاد آ گئے۔ ایک بار کہنے لگے کہ سر! جدید اردو ادب کے پانچ بنیاد گزار عناصرِ خمسہ کہلاتے ہیں، تو بھلا اسلام کے پانچ ارکان سے ان کا کیا تعلق ہے۔ ہم نے پوچھا یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ اردو ادب کے عناصرِ خمسہ کی وجہِ تسمیہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں؟ کہنے لگا فلاں استاد نے۔ ہم نے اپنا سر پیٹ لیا، حالاں کہ اس کا پیٹنا چاہیے تھا (استاد کا تو پھر بھی احترام ملحوظ ہے ورنہ اصولاً تو استاد کو پیٹا جانا چاہیے تھا)۔ خیال آیا کہ:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اسے سمجھایا کہ دراصل 'عناصرِ اربعہ' کی ترکیب کو مدِ نظر رکھ کر 'عناصرِ خمسہ' کی ترکیب گھڑی گئی ہے اور اردو میں عناصرِ خمسہ کی ترکیب سب سے پہلے غالباً مہدی اِفادی نے استعمال کی تھی[10]۔ پھر اسے بتایا کہ قدیم زمانے میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا کی ہر چیز چار عناصر سے مل کر بنی ہے، اور وہ چار عناصر ہیں: مٹی، ہوا، پانی اور آگ۔ اسی لیے انھیں عناصرِ اربعہ کہتے ہیں، اربعہ اور اربع کے معنی ہیں: چار۔ مہدی افادی نے جدید اردو ادب کی بنیادوں میں پانچ بڑے لکھنے والوں کی کاوشوں کو ثمر آور پایا تو ان کو عناصرِ خمسہ کا نام دیا، خمسہ یعنی پانچ۔ گویا کہنا یہ چاہتے تھے کہ جس طرح دنیا کی چار عناصر سے تشکیل ہوئی تھی جدید اردو ادب کی تشکیل کے بنیادی عناصر پانچ بڑے اہلِ قلم کی تحریریں ہیں۔ وہ پانچ بڑے لکھنے والے ہیں: سرسید احمد خاں، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور مولوی نذیر احمد دہلوی۔

جی ہاں! یہ وہی نذیر احمد ہیں جن کو آپ طالبِ علم 'ڈپٹی' نذیر احمد لکھنے سے باز نہیں آتے۔ بلکہ ناشرین بھی انھیں ڈپٹی ہی لکھتے ہیں۔ خدا جانے اردو والے ان کی 'ڈپٹی گیری' کی جان کب چھوڑیں گے۔ لاہور سے مولوی نذیر احمد دہلوی کی کلیات کسی ناشر نے چھاپی ہے، اس میں

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

ایک نام ور نقاد (دراصل مدرّس نقاد یا نوٹس نگار نقاد کہنا چاہیے) نے نذیر احمد کی تصانیف کے پرانے مطبوعہ نسخوں کو نظر انداز کر کے اغلاط سے پُر جدید نسخوں کو جمع کیا ہے اور نام رکھا ہے 'کلیاتِ ڈپٹی نذیر احمد'۔ وہ تو شکر ہے کہ مصطفیٰ زیدی کی کلیات کا نام ناشرین نے کلیاتِ ڈپٹی کمشنر مصطفیٰ زیدی نہیں رکھا، ورنہ زیدی ڈپٹی کمشنر تو تھے ہی۔ گویا کوئی ڈپٹی سکریٹری شاعر ہوا تو اس کی کلیات کا نام ہوگا کلیاتِ ڈپٹی سکریٹری فلاں۔ اسی طرح مکاتیبِ جوائنٹ سکریٹری فلاں، دیوانِ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس فلاں اور مجموعۂ نثرِ ممبر نیشنل اسمبلی فلاں بھی شائع کیے جاسکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جس معاشرے میں 'ڈپٹی' ہونا یا کسی اور عہدے پر فائز ہونا شاعر یا ادیب یا عالم ہونے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو وہاں اسی طرح کے لطیفے ہوتے ہیں۔ البتہ افسوس ناک خبر یہ ہے کہ اسلام آباد کی ایک جامعہ میں ایک طالبِ علم نے فرہنگِ کلیاتِ 'ڈپٹی' نذیر احمد مرتب کر کے پی ایچ.ڈی کی ڈگری لے لی ہے اور فرہنگ کی بنیاد اسی ناقص کلیاتِ 'ڈپٹی' نذیر احمد پر رکھی ہے جو جدید یعنی ناقص نسخوں سے مرتّب کی گئی ہے اور جس کے مرتّب تنقید کے نام پر طالبِ علموں کے لیے نصابی نوٹس کتابی صورت میں چھاپنے والے 'پروفیسر ڈاکٹر' صاحب ہیں۔

بقولِ غالب:

ع کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

صیہونی نہیں، صہیونی

مشرقِ وسطیٰ میں جاری جنگ کے تناظر میں آج کل خبروں میں صہیونیوں اور صہیونیت کا بہت ذکر آرہا ہے۔ لیکن افسوس کہ اکثر اخبارات ان الفاظ کا غلط املا لکھ رہے ہیں اور اسے صیہونی ('ص' کے بعد 'ی') لکھا جارہا ہے جب کہ درست املا صہیونی ('ص' کے بعد 'ہ') ہے۔ صہیون (ص ہ ی و ن) دراصل بیت المقدس کا بھی نام ہے اور اس نام سے ایک پہاڑی بھی یروشلم میں ہے۔

اس لفظ کی اصل عبرانی ہے جسے رومن حروف میں Zion لکھا جاتا ہے اور عربی میں اسے 'صہیون' لکھتے ہیں۔ اسی صہیون میں یائے نسبتی لگا کر صہیونی (Zionist) کا لفظ بنایا گیا ہے اور 'یت' کے اضافے سے صہیونیت (Zionism) بنا۔ صہیون یروشلم میں ایک مشہور مقام کا نام ہے[11]۔ یہ ایک پہاڑی ہے جس پر مسجد بنی ہوئی ہے اور صہیون کا ذکر بہت قدیم زمانے میں شاعر الاعشیٰ (میمون بن قیس) نے کیا ہے[12]۔

البتہ اردو کی بعض لغات میں صہیون کا غلط املا یعنی 'صیہون' درج ہے جس سے غلط املا کو فروغ ملا ہوگا اور اس غلط فہمی کے فروغ میں اردو لغت بورڈ کی لغت کا بھی ہاتھ ہے جس میں صیہون، صیہونی اور صیہونیت (غلط املا کے ساتھ) درج ہیں (جن میں 'ص' کے بعد 'ی' لکھی گئی ہے)[13]۔ لیکن یہاں بورڈ کی لغت کے مدیران کو التباس ہوا ہے اور اسی کی تقلید میں شان الحق حقی کی فرہنگِ تلفظ میں بھی یہ غلطی دہرائی گئی ہے اور صہیونی (ص ہ) کو صیہونی (ص ی) سے رجوع کرایا گیا ہے[14]۔ گویا مولف کے خیال میں صیہونی مرجح ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے کیوں کہ عربی لغات میں اس لفظ کا املا صہیون (ص ہ) ملتا ہے۔ مثلاً المورد کی انگریزی بہ عربی لغت میں لفظ Zion کے جو معنی درج ہیں ان میں سے ایک یہ ہیں: جبل صہیون بالقدس، یعنی القدس (بیت المقدس) میں صہیون کی پہاڑی۔ اس لغت میں لفظ صہیون (Zion) کے دوسرے معنی 'بیت المقدس' درج ہیں۔ اسی لغت میں Zionism اور Zionist اور Zionistic کے معنی بالترتیب الصہیونیہ، الصہیونی اور صہیونی لکھے ہیں[15] اور سب کے املا میں 'ص' کے بعد 'ہ' لکھا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کی بعض قدیم کتب میں بھی اس مقام کا املا صہیون ('ص' اور پھر 'ہ') درج ہے، مثال کے طور پر چھٹی صدی ہجری کے عالم یاقوت بن عبداللہ حموی کی معروف کتاب معجم البُلدان میں۔ اس کتاب کی اردو میں تلخیص غلام جیلانی برق نے کی تھی۔ اس کا ایک اندراج ملاحظہ ہو: ''صہیون: بیت المقدس کا ایک محلّہ، جس کے گرجے کا نام بھی صہیون ہے۔ نیز بحرِ شام کے ساحل پر ایک قلعہ''[16]۔

گویا درست املا صہیون (ص ہ ی و ن)، صہیونی (ص ہ ی و ن ی) اور صہیونیت (ص ہ ی و ن ی ت) ہے اور یہ املا قدیم زمانے سے عربی میں رائج ہے۔ اسے صیہون (ص ی ہ و ن) لکھنا غلط ہے۔

حواشی:

۱ محمود نیازی، تلمیحات (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۳ء)، ص ۹۶-۹۵ (بارِ دوم)؛ نیز قاضی عبدالقدوس عرشی ڈبائیوی، اردو تلمیحات و اصطلاحات (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۹۱ء)، ص ۸۱-۸۰۔

۲ فرہنگ آصفیہ، جلد اول (مرتبہ سید احمد دہلوی) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔

۳ کلیاتِ انشاء (جلدِ اول) (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی)، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۹ء)، ص ۲۶۹۔

۴ محمود نیازی، تلمیحات، محولۂ بالا، ص ۹۶۔

۵ اردو لغت (تاریخی اصول پر) (جلد دوم)، (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔

۶ نور اللغات، جلد اول (مرتبہ نور الحسن نیر)، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء) (طبعِ سوم)۔

۷ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۲، (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)؛ نیز اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد ۲ (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء) (بارِ دوم)۔

۸ مصباح اللغات (مرتبہ عبدالحفیظ بلیاوی)، (لاہور: المصباح، سنہ ندارد)۔

۹ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد ۲، محولۂ بالا۔

۱۰ مہدی افادی کا مضمون 'اردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ' نقاد کے ۱۹۱۳ء کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا اور بعد ازاں ان کی کتاب 'افاداتِ مہدی' میں شامل ہوا۔ ملاحظہ فرمائیے: افاداتِ مہدی (مرتبہ مہدی بیگم) (لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۴۹ء)، ص ۲۱۴-۲۰۴ (طبعِ چہارم)۔

۱۱ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد ۱۲ (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء) (بارِ دوم)۔

۱۲ ایضاً۔

۱۳ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۲ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)۔

۱۴ فرہنگِ تلفظ (مرتبہ شان الحق حقی) (اسلام آباد: ادارۂ فروغِ قومی زبان، ۲۰۲۲ء) (اشاعتِ نو)۔

۱۵ المورد: قاموس انکلیزی۔عربی (مرتبہ منیر البعلبکی) (بیروت: دار العلم للملایین، ۱۹۷۷ء)۔

۱۶ معجم البلدان: اسلامی شہروں کا فرہنگ (اردو تلخیص از غلام جیلانی برق) (لاہور: شیخ غلام علی، سنہ ندارد)، ص ۲۳۲۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اہم کتاب

آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ

بشیر بدر

- بشیر بدر برِّ صغیرِ ہندو پاک ہی نہیں، عالمی سطح پر مشاعروں کی دنیا کی ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شاعری نے مشاعروں میں شرکت کرنے والے ان کے ساتھی شعرا کے ساتھ مشاعروں کی بنیادوں کو بھی زیر و زبر کر دیا تھا۔ وہ تقریباً نصف صدی تک اردو غزل کے بانکپن سے سرشار گیسوے غزل کو سنوارتے رہے۔ بلاشبہ ان کا عہد مشاعروں کا ایک زرّیں عہد رہا ہے۔ بشیر بدر نے نثر میں بھی اپنی تحقیقی و تنقیدی عظمتوں کے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلے 1981 میں طبع ہوئی تھی، اس کا دوسرا اڈیشن 2023 میں نہایت خوب صورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔
- انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ہر عہد کی ایسی ہی شخصیتوں کی نادر تحقیقی و تنقیدی تحریروں کو اردو ادب کے عام قاری تک اپنے نفیس اور پُرکشش انداز میں پہنچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہی ہے۔ بشیر بدر کی کتاب 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم اور مفید کتاب ہے جس کی ایک دستاویزی حیثیت ہوگئی ہے۔
- بشیر بدر کی یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ ساتھ منفرد موضوعات کا مطالعہ کرنے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام قاری کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے۔

ضخامت: 343 صفحات —— قیمت: 500 روپے

قسط نمبر:6

مسائلِ لغت وقواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

ڈاکٹر ابراہیم افسر

گذشتہ سے پیوستہ

فرہنگِ عامرہ کے بارے میں رشید صاحب لکھتے ہیں کہ اس میں بیش تر مقامات پر صیغۂ امر حاضر کے معنی اسم فاعل کے لکھے ہوئے ہیں۔انھوں نے درج ذیل الفاظ:

آشام۔آشامندہ پینے والا''
''آرا آراستہ کرنے والا''
''آویز لپٹنے والا''
''آمیز ملنے والا''
''آور لانے والا''

کے بارے میں لکھا کہ مذکورہ صدر الفاظ بالترتیب آشامیدن، آراشتن، آویختن، آمیختن، آوردن کے صیغے امر حاضر کے ہیں۔اس بارے میں انھوں نے لکھا کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب صیغۂ امر کے اوّل کوئی اسم آجاتا ہے تو وہ اسم فاعل سماعی بن جاتا ہے۔یہ فارسی قواعد کا ایک ضابطہ ہے۔ ان تمام باتوں کے مدنظر رشید صاحب نے فرہنگ عامرہ میں درآئی غلطیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ مصنف فرہنگِ عامرہ نے قریب قریب ہر جگہ امر کے معنی اسم فاعل کے لکھے ہیں۔انھوں نے یہ بھی لکھا کہ فرہنگِ عامرہ کی ابتدا میں مصنف نے یہ واضح کیا کہ یہ فارسی اور ترکی الفاظ کا لُغت ہے۔رشید صاحب نے لفظ تنقید کے بارے میں وضاحت کی کہ یہ عربی الاصل لفظ نہیں ہے بلکہ عربی وزن پر ہندی نژاد لفظ ہے۔عربی میں اسے نقد وانتقاد کہتے ہیں۔ان تمام باتوں کے پیشِ نظر موصوف فرہنگِ عامرہ کے مصنف پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں مصنف فرہنگ عامرہ نے ایک دل چسپ غلطی کی ہے۔انھوں نے چوں کہ قریب قریب ہر جگہ امر کے معنی اسم فاعل کے لکھے ہیں۔اس لیے وہ آلودن مصدر کے ماضی مطلق صیغۂ واحد غائب آلود کو بھی صیغۂ امر سمجھ کر اس کے معنی 'لتھڑنے والا' لکھ گئے ہیں۔حالاں کہ اصل بات یہ ہے کہ آلود مرکب ہوکر 'اسم مفعول سماعی' کے معنی ضرور دیتا ہے۔ اسم فاعل کے نہیں۔جیسے غم آلود کہ اس کے معنی ہوئے 'وہ شخص جو غم میں ڈوبا ہوا ہے'، لیکن مطلق لفظ آلود کے یہ معنی نہیں آتے۔وہ ماضی مطلق ہی کے معنی دیتا ہے۔اسم مفعول سماعی بنانے کا ایک فعل ماضی کے اوّل کوئی اسم لاتے ہیں۔جیسے دست پرورد، خانہ زاد، وغیرہ، لیکن اسم فاعل سماعی کے لیے یہ طریقہ نہیں برتا جاتا۔بہرحال آلود کے فاعلی معنی غلط ہیں۔

فرہنگِ عامرہ کی ابتدا میں مصنف نے تصریح کردی ہے یہ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ کا لُغت ہے۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں جتنے الفاظ درج ہیں وہ انھی مذکورہ زبانوں ہی میں سے کسی زبان کے ہوں گے۔جب تک کہ کوئی صراحت نہ ہو۔اس کی فصل تامعہ نون میں لفظ تنقید درج ہے۔بغیر کسی صراحت کے تنقید عربی الاصل لفظ نہیں، بلکہ عربی وزن پر ہندی نژاد ہے۔عربی میں بجائے اس کے نقد و انتقاد لاتے ہیں، لیکن اُردو میں اس کا عام استعمال ہے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے، لیکن ایک لُغت کی کتاب میں اندراج کے لیے ضروری تھا کہ اس بات کی صراحت کر دی جاتی کہ یہ عربی الاصل نہیں۔اگرچہ اب مستعمل ہے بغیر اس تشریح کے اس لیے مناسب نہیں کہ ناواقف شخص اس کو بھی عربی الاصل سمجھے گا۔''[۵۴]

رشید حسن خاں کا ایک مضمون 'اُردو کے مترادف الفاظ' رسالہ نگار، جلد 62، شمارہ 2، بابت اگست 1952، ص 24 تا 26 شائع ہوا۔رشید صاحب نے یہ مضمون مارچ 1952 کے رسالہ 'نگار' میں شائع ہوئے حفیظ الرحمٰن واصف کے مضمون 'اُردو زبان کے مترادف الفاظ' کے جواب میں لکھا تھا۔اس مضمون میں واصف صاحب نے اُردو الفاظ کو بناوٹ کے اعتبار سے (۱) دخیل (۲) مہنداور (۳) مولّد میں تقسیم کیا تھا۔واصف صاحب نے 'مولد' الفاظ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ وہ الفاظ ہیں جن میں اُردو والوں نے تراش خراش کی ہو۔انھوں نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے لفظ فلاکت، نزاکت، افلاس اور مفلس کو پیش کیا اور انھیں فلک، نازک، اور مفلس سے مشتق بتایا۔رشید صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا کہ نزاکت اور فلاکت اہلِ فارس کے تصرفات ہیں اور فارسی سے دوسرے متصرف الفاظ کے ساتھ یہ بھی اُردو میں منتقل ہو گئے۔انھوں نے اپنی دلیل کے لیے کلاسکی شعرا کے کلام میں شامل الفاظ کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔رشید صاحب نے اپنے مضمون میں واصف صاحب کے مضمون سے مترادف الفاظ (۱) آنچ، تاؤ (۲) اُچھلنا، کودنا (۳) بانکا ٹیڑھا (۴) لٹکانا، ٹانگنا (۵) سایہ، چھاؤں (۶) کردار، چال چلن، کیرکٹر اور (۷) لونڈیا، لڑکی، بیٹی، بچی پر بحث کی۔

رشید حسن خاں کا ایک طویل مضمون 'اُردو ہماری زبان-ترتیبِ نو' رسالہ الحمراء، لاہور میں نومبر 1952 تا مارچ 1953 بالاقساط شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے اُردو زبان کی اساس اور اس میں شامل الفاظ پر بحث کی ہے۔مدیر رسالہ حامد علی خاں نے اس مضمون پر نوٹ لگاتے ہوئے لکھا کہ اُردو میں عربی، فارسی اور دیگر غیر زبانوں کے الفاظ دخل پا گئے ہیں، اُن کا تلفظ کیوں کر ہو؟ اصل زبان کے تلفظ کے مطابق؟ یا جیسا تلفظ اُردو میں غلط العام ہوکر رائج ہو چکا ہے؟ اس مسئلے کے بارے میں متعدد اہل الرائے حضرات وقتاً فوقتاً اظہار خیال کر چکے ہیں، مگر رشید صاحب نے اس پر بڑی تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ان کی نظر میں ابتدا سے ہی اُردو پر فارسی اور عربی زبانوں کے اثرات رہے ہیں، اور اُردو کی بنیاد ہندی افعال اور عربی و فارسی پر قائم ہوئی۔دکن میں اُردو کی نشو ونما میں وہاں کی مقامی زبانوں کا کردار رہا ہے۔انھوں نے اُردو اساتذہ کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ اساتذہ کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں پر نظر رکھیں کہ وہ کہیں غلط لفظ خلافِ لغت استعمال نہ کریں۔ رشید صاحب نے اپنے مضمون میں فہرستِ الفاظ کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔موصوف نے دخیل الفاظ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا:

''ہم کو یہ اصول مان لینا چاہیے کہ دوسری زبانوں کے جو الفاظ اُردو میں عموماً رائج ہیں وہ اب اُردو ہی کے ہیں۔جب ان کو اُس اصلی زبان میں استعمال کیا جائے گا تو وہ اس زبان سے متعلق ہوں گے۔اگر ہم اس قاعدے کو مان لیں (اور جس کا ماننا لازمی ہے) تو ہم ان اُلجھنوں سے بچ جائیں گے جو بہ صورت دیگر پیدا ہوسکتی ہیں۔جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اُردو کے سارے مستعملہ الفاظ اب اُردو ہی کے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب ان پر وہی ضوابط نافذ ہونا چاہییں جو اُردو سے متعلق ہوں، اور وہ سارے قاعدے جو آج تک ان الفاظ پر ان کی اصلی لغات یا گریمر کے واسطے سے عائد کیے جاتے رہے ہیں، غلط ہیں۔اس طرح ہم ان الفاظ کے اشتقاق وحرکات کے متعلق نئے ضابطے تراش سکتے ہیں اور یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ چوں کہ یہ لفظ اُردو میں اس طرح رائج ہے۔لہٰذا اسی طرح صحیح ہے۔''[۵۵]

رسالہ الحمراء، لاہور کے مختلف شماروں یعنی اگست 1956، ستمبر 1956، اکتوبر 1956، نومبر 1956، دسمبر 1956، جنوری 1957 اور جون 1957 میں رشید حسن خاں کا طویل مضمون 'غلطی ہائے تحقیق' شائع ہوا۔اس مضمون میں انھوں نے سرمایہ زبان اُردو، بہار عجم، لغات النوا تین، نور اللغات، غیاث اللغات، ازاحتہ الاغلاط وغیرہ میں شامل محاوروں اور لفظوں کی اصل بنیاد پر بحث کی ہے۔انھوں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں ہی اس بات کی وضاحت کی کہ مضمون 'اُردو کی ترتیبِ نو' کے دوران اُردو، فارسی اور عربی کے متعدد لغات پیشِ نظر تھے۔اس لیے انھوں نے ہلکے پھلکے مضامین کے بجائے خشک اور ٹھوس کام کا انتخاب کیا۔رشید صاحب نے اس امر کی جانب بھی واضح اشارہ کیا کہ کسی ایک خاص علاقے کے لفظ کو اُردو کے فصیح لفظ پر ترجیح نہ دی جائے۔اس ضمن میں انھوں نے لفظ ملائی-بالائی پر بحث کرتے ہوئے سرمایۂ زبان اُردو، گذشتہ لکھنؤ، نور اللغات، لغات النوا تین سے مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھا کہ بالائی کا لفظ غلط تو درکنار فصیح تر ہے لیکن ملائی کا لفظ بھی غلط نہیں، دونوں لفظ مستعمل ہیں۔لکھنؤ وغیرہ میں آج کل بالعموم بالائی بولتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ بہت سے مقامات ایسے بھی ہوں گے جہاں کے لوگ ملائی کو فصیح سمجھتے ہوں گے۔ممکن ہے جلال کو یہ لفظ اچھا نہ معلوم ہوتا ہو، لیکن اس صورت میں ان کو یہ لکھ دینا چاہیے تھا کہ میرے نزدیک بالائی غیر فصیح ہے۔تغلیط کا فتویٰ غلط ہے۔اس ضمن میں رشید صاحب مزید لکھتے ہیں:

''مرحوم جلال لکھنوی اُردو کے معروف ومستند اساتذہ میں سے تھے۔'سرمایۂ زبانِ اُردو' موصوف کا مشہور لُغت ہے۔محقق زبان ہونے کے اعتبار سے امیر مینائی کے بعد لکھنؤ میں انھیں کا نام آتا ہے، لیکن اس لُغت میں متعدد مقامات محل نظر ہیں، جن میں سے ایک دو کے متعلق تو تحریف کتابت کا بھی گمان ہوسکتا ہے، بعض کے متعلق کرشمۂ بشریت یا غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ایسے الفاظ درج ذیل ہیں:

(۱) ملائی۔ہمزہ تحتانی معروف کے ساتھ۔ایک چیز معروف کے ساتھ، ایک چیز ہوتی ہے دودھ کی بہت لذیذ اور عمدہ، لطیف کہ اس کو نانخورش کرتے ہیں۔ف: سرِ شیر (...) اور یہ جو لوگ اس کو بالائی ہائے موحدہ اور الف کے ساتھ بولتے ہیں، غلط بولتے ہیں؟...(سرمایہ زبان اُردو) مصنف کا یہ فرمانا کہ بالائی غلط ہے صحیح نہیں۔اصلاً یہ لفظ ملائی ہی تھا لیکن چوں کہ نواب آصف الدولہ (یا ایک روایت کے اعتبار سے نواب سعادت علی خاں) اس کو بہت پسند کرتے تھے۔اس لیے ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

اردو سنسکرت کے لیے طلبہ کی شرط ختم کی جائے

انوار الحسن وسطوی

پٹنہ (2 اگست)۔ وزیرِ تعلیم متھلیش تیواری کے اس حالیہ بیان کا — جس میں انھوں نے کہا ہے کہ جن سرکاری اسکولوں میں اردو کے کم از کم دس طلبہ ہوں گے وہاں ایک اردو استاد اور جہاں سنسکرت کے کم از کم پانچ طلبہ ہوں گے وہاں ایک سنسکرت استاد کا تقرر کیا جائے گا — تعلیمی حلقوں میں خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ تاہم معروف ماہرِ تعلیم، مصنف اور سینئر صحافی انوار الحسن وسطوی نے اس پالیسی کو مزید موثر بنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اور سنسکرت دونوں زبانوں کے لیے طلبہ کی کم از کم تعداد کی شرط ختم کر کے ریاست کے ہر سرکاری اسکول میں ان زبانوں کے اساتذہ کے تقرر کو لازمی قرار دیا جائے۔

اپنے بیان میں انھوں نے کہا کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا آئینی اور قانونی درجہ حاصل ہے جب کہ سنسکرت بھی ملک کی قدیم اور اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں دونوں زبانوں کی تعلیم کو چند طلبہ کی تعداد سے مشروط کرنا نہ صرف ان زبانوں کے فروغ میں رکاوٹ ہے بلکہ طلبہ کے تعلیمی حقوق کو بھی محدود کرتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت اگر واقعی اردو اور سنسکرت کے تحفظ و فروغ کے لیے سنجیدہ ہے تو اسے ہر اسکول میں ان زبانوں کے اساتذہ کی موجودگی یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ گذشتہ کئی برسوں سے بہار کے متعدد اسکولوں میں اردو اساتذہ کی اسامیاں خالی ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں، جس کے نتیجے میں ہزاروں طلبہ اردو پڑھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہی صورتِ حال سنسکرت کے سلسلے میں بھی مختلف علاقوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسے میں طلبہ کی تعداد کو جواز بنا کر تقرر نہ کرنا مسئلے کا حل نہیں بلکہ اس میں مزید اضافہ کرنا ہے۔ انھوں نے حکومت سے اپیل کی کہ محکمۂ تعلیم فوری طور پر ایسا حکم نامہ جاری کرے جس کے تحت ریاست کے ہر سرکاری اسکول میں کم از کم ایک اردو اور ایک سنسکرت استاد کا تقرر لازمی ہو۔ ان کے مطابق یہی اقدام دونوں زبانوں کے فروغ، آئینی تقاضوں کی تکمیل، تعلیمی مساوات اور نئی نسل کو لسانی و ثقافتی ورثے سے جوڑنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوگا۔ (آوازِ بہار۔ پٹنہ)

'پدم بھوشن حکیم عبدالحکیم ملک وملّت کا عظیم سرمایہ تھے'

نئی دہلی (23 جولائی)۔ عالمی شہرت یافتہ دواساز کمپنی ہمدرد نے اپنے بانی پدم بھوشن، محسنِ طب حاجی حکیم عبدالحمید کے 27 ویں یومِ وفات پر ایک تقریب بعنوان 'حکیم صاحب کی یادیں' انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کی لائبریری میں منعقد کی۔ اس پُروقار تقریب میں حکیم صاحب سے وابستہ رہیں کئی اہم شخصیات نے شرکت کر کے حکیم صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان سے متعلق کئی واقعات سامعین کو بتائے۔ تقریب میں اپنے صدارتی کلمات کے دوران سنٹر کے صدر اور سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید نے حکیم صاحب کے ذریعے جامعہ ہمدرد کے لیے زمین تلاش کرنے کی جستجو پر کہا کہ زمین وہی تلاش کرتے ہیں جن کے پاس ضمیر ہوتا ہے اور آج لوگ زمین تلاش کرنے میں ضمیر کو بھول جاتے ہیں۔ حکیم صاحب کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج ہمیں احساس ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کی شکل میں ہمارے پاس کتنا بڑا سرمایہ تھا، مگر آج افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پاس سرمایہ نہیں بچا۔ انھوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ انڈیا اسلامک کلچر سنٹر کی لائبریری میں حکیم صاحب سے وابستہ کتب کا ایک گوشہ بنایا جائے، یہ انھیں خراجِ عقیدت کا ایک طریقہ ہوگا۔ وہ ہمارے ہیرو تھے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ ان کی یاد میں یہاں ایک بڑی تقریب منعقد کریں۔

عبدالمجید ثانی، چیئرمین مینجنگ ٹرسٹ ہمدرد لیبارٹریز انڈیا نے اپنے دادا جان حاجی حکیم عبدالحمید سے وابستگی کا تفصیل سے ذکر کیا اور بتایا کہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ان کی برسوں صحبت حاصل ہوئی، گھر میں چھوٹا ہونے کے ناطے میرے لیے ایک وقت متعین کیا ہوا تھا اور اس دوران میں ان سے سوالات بھی کیا کرتا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میں دل سے کام کرتا ہوں اور تم لوگ دماغ سے کام کرتے ہو۔ اگر میں نے دماغ پر چھوڑ دیا ہوتا تو یہ یونیورسٹی کبھی نہیں بنتی۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ آنجہانی راجیو گاندھی جامعہ ہمدرد میں آئے اور انھوں نے حکیم صاحب سے کہا کہ کیا آپ مجھے اپنی یونیورسٹی نہیں دکھائیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ راجیو گاندھی اکثر اپنا پروٹوکول توڑ دیتے تھے اور جامعہ میں بھی انھوں نے یہی کیا اور گاڑی میں حکیم صاحب کو بٹھا کر وہاں کا جائزہ لیا اور گاڑی خود چلائی۔ پدم شری ڈاکٹر محمد ولی نے حکیم صاحب کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک مرتبہ وزارتِ صحت میں حکیم صاحب کا جانا ہوا اور مرکزی وزیرِ صحت کو جب اس کا علم ہوا کہ حکیم صاحب تشریف لائے ہیں تو وہ خود اپنے کمرے سے باہر آئے اور حکیم صاحب کا استقبال کرتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔

اسلامک سنٹر کے بورڈ آف ٹرسٹی ڈاکٹر خواجہ شاہد نے کہا کہ اس سنٹر پر حکیم صاحب اور حکیم صاحب پر سنٹر کو پورا حق ہے کیوں کہ حکیم صاحب نے سنٹر کے قیام کے لیے جو خدمت انجام دی وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی اور میں سلمان خورشید صاحب سے درخواست کروں گا کہ یہاں حکیم صاحب کی کوئی یادگار قائم کی جائے۔ انھوں نے بے شمار ادارے قائم کیے، وہ مین آف ایکشن تھے۔ تقریب کے دوران محمد زہیر، سینئر جنرل منیجر اینڈ ہیڈ سیلز اینڈ میڈیکو مارکیٹنگ نے کہا کہ ہم ہر سال نہایت احترام کے ساتھ اس تقریب کا انعقاد کرتے ہیں اور اس میں حکیم صاحب سے وابستہ شخصیات کو مدعو کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کے چاہنے والے کسی مذہب، کسی پیشے یا کسی علاقے تک محدود نہیں تھے۔ ڈاکٹر نینا کھنہ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ امریتا ہسپتال فرید آباد نے بھی حکیم صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اظہارِ تشکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد صدیقی سابق ڈائرکٹر جنرل سی سی آر یو ایم نے کہا کہ آج حکیم صاحب موجود نہیں ہیں مگر ان کی موجودگی کا احساس ہم کر سکتے ہیں۔ (انقلاب۔ دہلی)

'کشمیریت کی جڑ اردو، فارسی اور کشمیری زبانوں میں پیوست'

سری نگر/ دہلی (پریس ریلیز)۔ چنار بک فیسٹول کے تیسرے اڈیشن میں آتھر کارنر میں 19 جولائی کو ایک مذاکرہ بعنوان 'اردو، کشمیریت اور مشترکہ تہذیبی روایات کی مینا کاری' منعقد کیا گیا۔ قومی اردو کونسل نئی دہلی کی جانب سے منعقد کیے جانے والے اس مذاکرے میں پروفیسر مفتی مدثر فاروقی (نامور اسکالر و صدر شعبۂ انگریزی، یونیورسٹی آف کشمیر)، اور محترمہ آسیہ قدیر (صدر برلا اوپن مائنڈس انٹرنیشنل اسکول، سری نگر) نے بطور پینلسٹ شرکت کی اور ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن نئی دہلی) نے اسے موڈریٹ کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل نے اپنے مہمانوں کا شال پوشی کے ذریعے استقبال کیا اور اس اہم پروگرام میں شریک ہونے پر ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

مذاکرے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر مفتی مدثر فاروقی نے کہا کہ تصوف اور مشترکہ تہذیبی روایات کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے صوفیا کی آمد سے قبل ہی کشمیر کی سرزمین مشترکہ تہذیبی عناصر کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ یہاں کے رشیوں نے مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ماحول کو سازگار بنایا اور مختلف طبقات و مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تصوف کے بنیادی نکتے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ محبت ہی کائنات کی تخلیق کا بنیادی محرک ہے۔ کشمیریت اور یہاں کی تہذیب سے نئی نسل کی وابستگی کے لیے اردو اور کشمیری زبان سے واقفیت کو لازمی قرار دیتے ہوئے انھوں نے ان زبانوں کو سیکھنے کی ترغیب دی اور کہا کہ اردو اتنی شیریں زبان ہے کہ اگر اس سے معمولی سی بھی واقفیت ہو تو مزید جاننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ نئی نسل کو اپنی وراثت کے تحفظ کے لیے اس زبان کو ضرور سیکھنا چاہیے۔ کشمیریت کی جڑ اردو، فارسی اور کشمیری زبانوں میں پیوست ہے۔

مذاکرے کی دوسری شریک محترمہ آسیہ قدیر نے کشمیریت اور مشترکہ تہذیبی روایات کے فروغ میں خواتین کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ماں کا کردار ہمارے گھر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور ایک خاتون صرف گھر کی معمار نہیں ہوتی بلکہ وہ سوسائٹی اور ملک کی بھی تعمیر کرتی ہے۔ انھوں نے شعر و ادب کی دنیا میں خواتین کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ادا جعفری کا بطور خاص ذکر کیا۔

اس مذاکرے کو ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے نہایت خوب صورتی سے موڈریٹ کرتے ہوئے مہمان مقررین سے کئی اہم نکات پر گفتگو کی۔ چنار بک فیسٹول کے دوسرے روز چلڈرن کارنر میں بچوں سے متعلق کئی سرگرمیاں بھی انجام دی گئیں اور مختلف ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے گئے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پر 'اردو گلبن' کا دستاویزی خصوصی شمارہ

حیدرآباد (2 اگست)۔ آن لائن شائع ہونے والے پندرہ روزہ ادبی و ثقافتی رسالہ 'اردو گلبن' کا انیسواں شمارہ (یکم تا 15 اگست 2026) شائع ہو چکا ہے۔ 'اردو گلبن' کو برِّصغیر کے عظیم علمی و تحقیقی ادارے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے نام مُعنوَن کرتے ہوئے ایک خصوصی دستاویزی شمارہ شائع کیا گیا ہے جس میں اس تاریخی ادارے کی علمی، ادبی، تہذیبی اور تحقیقی خدمات کو مختلف جہات سے اجاگر کیا گیا ہے۔ رسالے کے مدیر اعلا مہتاب قدر نے اپنے اداریے 'مکتبات کی علمی و ادبی حیثیت' میں لائبریریوں کو قوموں کے علمی ورثے کا امین قرار دیتے ہوئے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی گراں قدر خدمات اور اس کے عالمی علمی مقام پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ شمارے میں حمدِ باری تعالیٰ، نعتیہ کلام، تحقیقی مقالات، علمی و ادبی مضامین، افسانے، غزلیں، منظومات، تبصرے، ادبی خبریں اور قارئین کے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ شمارے میں پروفیسر زاہد الحق خدا بخش اورینٹل لائبریری کے نئے ڈائرکٹر سے انٹرویو (مرزا محمد نواب، جدہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: عابد سے زاہد تک (ڈاکٹر ارتضیٰ کریم)، خدا بخش لائبریری پر یادگاری ڈاک ٹکٹ: ایک اعتراف (مرزا محمد نواب، جدہ)، ڈاکٹر عابد رضا بیدار: خدا بخش لائبریری کے سابق سربراہ: حیات اور خدمات (مہتاب قدر، جدہ)، خدا بخش لائبریری تہذیبی اقدار کا مظہر و تہذیبی شناخت کا ایک حوالہ (حقانی القاسمی)، خدا بخش اورینٹل لائبریری کی علمی خدمات (سلیم خان، امریکہ)، خدا بخش لائبریری برِّصغیر میں علم و تہذیب کی محفوظ میراث و امانت (یاسمین اختر طوبیٰ، گوجرہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ایک عظیم تحقیقی مرکز (محمد ابوبکر، مونگیر)، خدا بخش اورینٹل لائبریری میں گوشہ دسنہ (جمال محسن)، خدا بخش لائبریری ایک الگ شناخت (ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، پٹنہ)، نادر مشرقی قومی اثاثہ خدا بخش لائبریری (پروفیسر مجید بیدار)، ایک یادگار نظم بیادِ مولوی خدا بخش خاں (احمد علی برقی اعظمی مرحوم) عنوانات پر مضامین شامل ہیں۔ افغانستان کی نیشنل پبلک لائبریری پر بھی معلوماتی مضمون شامل کیا گیا ہے۔

(روزنامہ عصرِ حاضر۔ حیدرآباد)

منشیات کے خلاف انجمن ترقی اردو بہار کی مہم

پٹنہ (3اگست)۔عبدالقیوم انصاری (سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار و سابق چیئرمین بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) نے ایک پریس بیان میں کہا ہے کہ سابق وزیر اعلیٰ ستیش کمار کے ذریعے بہار میں شراب بندی قانون لاکر بہار کو نشہ مکت کرنے کی جو کوشش کی گئی اس کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے ہیں، اس کے بعد بھی بلاتفریق مذہب وملّت ہر طبقے کے نوجوان نشے کے عادی بتائے جارہے ہیں، حکومتِ ہند کے ذریعے ہندستان کے نوجوانوں کو منشیات سے روکنے کے لیے مہم چلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔اسی کے طرز پر انجمن ترقی اردو بہار نے قانونِ اردو کے عملی نفاذ کے ساتھ ساتھ بہار کے نوجوانوں کو نشہ مکت کی ترغیب دینے کے لیے تمام ضلع اور بلاک سطح کی کمیٹیوں کے ذمے داروں کو اردو کے تئیں نوجوانوں کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو نشے سے دور رہنے کے لیے مہم چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔

(روزنامہ پندار۔پٹنہ)

سابق صدر شعبۂ اُردو
پروفیسر آفتاب اشرف کی سبکدوشی پر تہنیتی تقریب

دربھنگہ (3اگست)۔للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے ممتاز ماہرِ تعلیم، سابق صدر شعبۂ اردو، نامور محقق، نقاد اور دانشور پروفیسر آفتاب اشرف کی باوقار سبکدوشی کے موقعے پر مہاتانی کلیانی کالج، لہریا سرائے، دربھنگہ کے پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ کے دولت کدے پر ایک پُروقار تہنیتی تقریب منعقد ہوئی۔اس موقعے پر متھلا کی روایتی تہذیب کے مطابق ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے پروفیسر آفتاب اشرف کو شال، ڈائری اور قلم پیش کرکے ان کی گراں قدر علمی، تعلیمی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف کیا۔ تقریب میں للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسران، ایسوسی ایٹ پروفیسران، پروفیسران، محققین اور دیگر معزز شخصیات کی بڑی تعداد موجود تھی جنھوں نے پروفیسر آفتاب اشرف کی علمی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے کہا کہ ڈاکٹر آفتاب اشرف اپنے آپ میں ایک ادارہ، ایک روایت اور اردو دنیا کا ایک معتبر نام ہیں۔انھوں نے ایم. ایل. ایس. ایم. کالج سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور بعد ازاں للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ 31 جولائی 2026 کو انھوں نے اپنی آخری کلاس لے کر ایک کامیاب، باوقار اور بے داغ تعلیمی سفر مکمل کیا۔ڈاکٹر رحمت اللہ نے اپنی پرانی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میرا تعلق ڈاکٹر آفتاب اشرف سے آج کا نہیں بلکہ 79-1978 سے ہے۔ ہم دونوں اپنے استادِ محترم مولانا مطیع الرحمٰن (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے منور کرے) کے شاگرد ہیں۔ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے کہا کہ پروفیسر آفتاب اشرف نے اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ان کے متعدد تحقیقی مقالات قومی اور بین الاقوامی جرائد میں شائع ہوئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بہار پبلک سروس کمیشن (BPSC) میں اردو مضمون کے ماہر کی حیثیت سے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اردو کے جدید نصاب کی تیاری میں ان کا کردار نہایت اہم رہا۔ مختلف کالجوں میں پرنسپل کی حیثیت سے انھوں نے کامیابی سے انتظامی خدمات انجام دیں اور یونیورسٹی کی متعدد اہم کمیٹیوں کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنی ذمے داریاں بخوبی نبھائیں۔ آج انھیں عزت و وقار کے ساتھ ملازمت سے سبکدوش ہونے کا جو اعزاز حاصل ہوا ہے وہ ہر شخص کے نصیب میں نہیں ہوتا۔تقریب کے اختتام پر موجود تمام اساتذہ، اہلِ علم اور معزز شخصیات نے پروفیسر آفتاب اشرف کو ان کی بے داغ، باوقار اور مثالی ملازمت کی تکمیل پر دلی مبارک باد پیش کی، ان کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا اور ان کی صحت، خوش حالی اور درازیِ عمر کے لیے دعا کی۔تقریب دعا اور نیک تمناؤں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

(روزنامہ پندار۔پٹنہ)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ڈاکٹر بانو سرتاج

ایوت محل۔بچوں کی معروف ادیب، افسانہ نگار اور مترجم ڈاکٹر بانو سرتاج طویل علالت کے بعد جمعرات 13 اگست 2026 کو 81 برس کی عمر میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئیں۔ان کا تعلق خطۂ ودربھ کے ضلع ایوت محل سے تھا لیکن انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ چندر پور میں گزارا۔ آخری برسوں میں وہ ایوت محل منتقل ہوگئی تھیں۔ ان کی پیدائش 17 جولائی 1945 کو ایوت محل ضلع کی پانڈھرکوڑا تحصیل میں ہوئی۔کوئلوں کی کانوں کے لیے مشہور چندر پور میں علم و ادب کی شمع جلانے کے بعد انھوں نے ایوت محل شہر میں سکونت اختیار کی تھی اور یہیں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔وہ ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار، مزاح نگار، مترجم اور مصنف تھیں۔

بچوں کے ادب میں وہ چنندہ خواتین قلم کاروں میں سے ایک تھیں اور پورے ملک میں بچوں کے لیے ان کی کاوشوں کی وجہ سے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔انھوں نے بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں، ناول اور ون ایکٹ ڈرامے لکھے۔ وہ اردو، ہندی اور انگریزی میں مہارت رکھتی تھیں اور تینوں زبانوں میں انھوں نے تقریباً 120 کتابیں تصنیف کیں۔ان کی ادبی خدمات پر ملک کی مختلف ریاستی حکومتوں اور اہم ادبی انجمنوں نے انھیں اعزازات سے نوازا تھا جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، صدر جمہوریہ ایوارڈ، مہاراشٹر، یوپی، بہار اور دہلی اردو اکادمیوں کے ایوارڈز شامل ہیں۔ڈاکٹر بانو سرتاج تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں بھی مصروف رہتی تھیں۔وہ لاولد تھیں اور شوہر قاضی عبدالاحد کے انتقال کے بعد سے ہی وہ ایوت محل کے چندر نگر میں قیام پذیر تھیں۔انتقال کے بعد جمعرات کو ہی بعد نمازِ عشا ایوت محل شہر کے پرانے قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔

پروفیسر وھاب قیصر

حیدرآباد۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے اولین کنٹرولر برائے امتحانات اور انچارج وائس چانسلر پروفیسر سیّد عبدالوہاب (وہاب قیصر) کا جمع 24 جولائی 2026 کو 77 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پس ماندگان میں ان کی اہلیہ نصرت زمانی ہیں۔ پروفیسر ایس. اے. وہاب نے 2002 میں 'مانو' کے کنٹرولر امتحانات کی حیثیت سے اپنی خدمات کا آغاز کیا تھا۔وہ اس سے قبل ممتاز کالج، حیدرآباد میں بحیثیت پرنسپل خدمات انجام دے رہے تھے۔مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 8 جنوری 2003 کو انھوں نے اولین وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری سے 'وی سی' کے عہدے کا چارج لیا۔ انچارج وی سی کی ذمے داری انھوں نے 2004 میں پروفیسر اے ایم پٹھان کے عہدہ سنبھالنے تک نبھائی۔انھیں مختلف وقتوں میں رجسٹرار انچارج کی ذمے داری بھی دی گئی۔

30 ستمبر 2014 کو وہ سبکدوش ہوئے لیکن یونیورسٹی نے ان کی خدمات سے استفادے کا سلسلہ جاری رکھا اور انھیں انچارج کنٹرولر امتحانات کے عہدے کی دوبارہ ذمے داری دی گئی۔ بعد میں انھیں 'آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی' کے عہدے پر مامور کیا گیا جہاں وہ 2018 تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے فزکس کے مضمون میں پی ایچ. ڈی کی تھی لیکن اردو زبان و ادب سے انھیں گہرا شغف تھا۔انھوں نے اردو میں کئی اہم کتابیں تصنیف کیں جن میں 'غالب اور سائنس' قابلِ ذکر ہے۔ان کے انتقال پر وائس چانسلر پروفیسر سیّد عین الحسن اور رجسٹرار پروفیسر اشتیاق احمد نے اپنے گہرے صدمے اور دکھ کا اظہار کیا اور ان کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے ان کے انتقال کو یونیورسٹی کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔

امیر احمد راجہ

نئی دہلی۔معروف کرائم رپورٹر اور ورکنگ جرنلسٹ کلب کے نائب صدر امیر احمد راجہ 11 اگست 2026 کو مختصر علالت کے بعد اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ 67 برس کے تھے۔تقریباً چار روز تک لوک نائک جے پرکاش (ایل این جے پی) اسپتال میں زیرِ علاج تھے، جہاں ان کی حالت تشویشناک ہونے کے بعد انھیں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی صحافتی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔امیر احمد راجہ نے اپنی صحافتی زندگی کا بیشتر حصہ اردو صحافت میں جرائم کی رپورٹنگ کے لیے وقف کیا۔ وہ دہلی کے جرائم اور پولیس سے متعلق خبروں پر گہری نظر رکھتے تھے اور کئی دہائیوں تک اس شعبے میں اپنی منفرد شناخت قائم رکھی۔ ان کی رپورٹنگ میں خبر کی تہ تک پہنچنے، حقائق کی تصدیق اور ذرائع سے مضبوط رابطے کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔امیر احمد راجہ نے اپنے طویل صحافتی سفر کے دوران پرتاپ، فیصل، ملاپ، اِن دنوں، مشرقی آواز، عوام اور نئی دنیا سمیت متعدد اخبارات میں خدمات انجام دیں۔ کچھ برسوں تک انھوں نے سیاسی تقدیر میں بھی کام کیا۔صحافت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ انھوں نے خود کو بھی ہم آہنگ کیا اور 2015 میں اردو نیوز سروس کے نام سے اپنی ایجنسی قائم کی جس کے ذریعے وہ فری لانس صحافتی خدمات انجام دیتے تھے۔ امیر احمد راجہ کے انتقال سے اردو صحافت بالخصوص دہلی کی کرائم رپورٹنگ کو ایک بڑا نقصان پہنچا ہے۔صحافتی حلقوں نے ان کے انتقال کو ایک عہد کا خاتمہ قرار دیتے ہوئے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ امیر احمد راجہ کی نمازِ جنازہ بعد نماز عصر کوچہ پنڈت کی مسجد چاندی والی میں مولانا یعقوب نوری نے پڑھائی جس میں صحافیوں، سماجی و سیاسی شخصیات، دوستوں، عزیزوں اور بڑی تعداد میں اہلِ علاقہ نے شرکت کی۔نمازِ جنازہ کے بعد ان کا جنازہ دہلی گیٹ قبرستان لے جایا گیا جہاں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ بڑی تعداد میں صحافتی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے ان کے جنازے میں شرکت کی اور ان کے لیے دعاے مغفرت کی۔ ورکنگ جرنلسٹ کلب کے صدر محمد راحم رفیع نے کہا کہ امیر احمد راجہ اُن صحافیوں کی صف میں شامل تھے جنھوں نے اس پیشے کو اپنی ساری زندگی دے دی۔انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود اس پیشے کو نہیں چھوڑا، وہ اس پیشے سے اور اردو زبان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے نائب صدر محمد تقی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ امیر احمد راجہ بہترین اردو صحافی ہونے کے ساتھ نمازی، پرہیزگار شخص تھے۔وہ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ ماہِ رمضان میں وہ پابندی کے ساتھ مسجد چاندی والی میں لوگوں کو سحری کے وقت جگاتے، نعتِ رسولِ مقبولؐ سناتے اور اذان بھی دیا کرتے تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : ہر ایک جنم کی جانما (ناول)
مصنف : محمد حفیظ خان
ضخامت : 272 صفحات
ناشر : بک کارنر، جہلم
تبصرہ نگار : شاہد اقبال کامران

Mobile No.: +92 3245027891

شہر بہاولپور دوستوں ،دلداروں اور پیاروں کا شہر ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے یہ ایک خودمختار ریاست ہوا کرتا تھا۔ برِّصغیر کی خود معاملہ ریاستوں کی خودمختاری اگرچہ تاج برطانیہ کی سیاسی حکمت عملیوں اور تاج کے عہدے داروں اور اہلکاروں کی نگاہ غلط انداز کی پابند ہوا کرتی تھی، پھر بھی والیان ریاست کو رعایا کے ساتھ کچھ بھی کر گزرنے کی اجازت اور آزادی عام تھی۔ اس آزادی کا سب سے زیادہ استعمال ریاست کی بوجہِ حسن و جمال حرماں نصیب حسیناؤں پر ہوتا تھا کہ جن کو نواب یا والی ریاست کے حرم میں قید کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔ شاید مرد حکمراں اپنے آقاؤں کے ہاتھوں ملنے والی ذلت اور ہزیمت کا انتقام انھی پابند حرم کنیزوں سے لے کر خود کو طاقتور سمجھنے کا نشہ کرتے ہوں اور یوں مسرور ہوتے ہوں؟ اب بہاولپور نہ کوئی ریاست ہے اور نہ اب کوئی حرم ہی باقی رہ گیا ہے۔ اب جو کچھ بھی ہے، وہ تاریخ کے سینے میں بند، تحریر کے آئینے میں عیاں اور تقریر کے آہنگ میں شنیدہ ہے۔ اب بہاولپور صرف ایک شہر ہے، جواب بھی اپنے ماتھے پر تاریخی محلات، فقید المثال مساجد اور وسیع و عریض تعلیمی اداروں کا جھومر سجائے بیٹھا ہے۔ ریاست بہاولپور کے احوال و واقعات، قصے کہانیاں، کہنیاں اور کہہ مکرنیاں، سچے جھوٹے مفروضے اور معروضے؛ سب ایک دھند، ایک کہر اور کبھی کبھار ایک بڑے بادل کی طرح ریاست بہاولپور کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور سیاست پر چھائے رہتے ہیں۔ ریاست بہاولپور کا سیاسی ماڈل تاج کی غیر مشروط اطاعت پر مبنی تھا، اس اطاعت کے بعد ضبطِ نفس کا اہتمام وہ مقامیوں سے لیتے رہے، والیان ریاست تاج کی نیابت کے عوض ملازمت میں مگن اور خوش تھے۔ ریاست بہاولپور کا خود کو سرکار انگلشیہ کے حضور اطاعت کے لیے پیش کرنے کی وجوہ میں ایک طرف سے سندھ تو دوسری طرف سے راجہ رنجیت سنگھ کے پنجاب کی طرف سے لاحق خطرات تھے اور برِّصغیر کی تاریخ باور کراتی ہے کہ جب انگریز کسی ریاست، علاقے یا نظریے کی حفاظت کا ذمہ لے لیتے ہیں تو پھر اس ریاست، علاقے یا نظریے کو سوائے انگریزوں کے؛ کسی اور سے خطرہ نہیں رہتا۔ محمد حفیظ خان کا ناول 'ہر ایک جنم کی جانما' ریاست بہاولپور کی تاریخ اور تاریخ سے جنم لینے والی طرز؛ یعنی ثقافت کا آئینہ معلوم ہو رہا ہے۔ اُردو ناول نگاری تاریخ کو فکشن بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، یہ بالکل ویسی بات ہے جیسے ہمارے چنیدہ مورخین فکشن کو تاریخ بنانے میں ید طولی، مہارت تامہ اور دسترس کامل رکھتے ہیں، لیکن 'ہر ایک جنم کی جانما' ایک مکمل ناول ہے، جس کے زندہ اور متحرک کردار، جس کی متوازی کہانیاں اور جس کی فراست آفرینی اس کی معنی خیزی اور ناول کے اندرونی کلچر کو متاثر اور مستحکم کرتی ہیں۔ ریاست بہاولپور کے بہت سے احوال کا ذکر دوست احباب زیرِ لب مسکراتے ہوئے کرتے تھے، بعض رسمیں، بعضے رواج بھی حیران کر دیتے۔ اب اس ساری دھند کو ہٹا کر، یعنی ناول کو کھول کر ریاست بہاولپور کی سیاست، تاریخ، تہذیب، ثقافت اور معیشت و معاشرت کے مناظر اور مظاہر کو دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ناول نگار حفیظ خان یقینی طور پر بے حد خوش خوراک ہوں گے، تبھی تو اس ناول میں وہ انواع و اقسام کے ذائقوں سے آشنا اور کمال درجے کے لذت شناس معلوم ہو رہے ہیں۔ عورت کے بیانِ حسن اور انتہائے کشش کو لذت اور ذائقوں کے پیرایے میں بیان کرنا ناول نگار کے مشاہدے کی وسعت اور تجربے کے تنوع کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ ایک عورت کے بیانِ حسن کی کیفیت دیکھیں:... حیرت تھی کہ کوئی عورت اتنی چٹی چٹور، اتنی خوشبودار اور لذیذ بھی ہو سکتی ہے کہ جیسے حسینہ تھی۔ بالکل اُس کھیرنی کی طرح کا ذائقہ تھا کہ جسے اُس کی ماں پوہ ماگھ کی سرد راتوں میں کھانڈ اور کیوڑا ڈال کر گائے کے ملائی والے دودھ میں بناتی اور ساری رات باہر چھکے میں لٹکا کر صبح صبح اُسے کھانے کے لیے دیتی۔۔۔ ایسے ہی ایک خیال آیا، کہ پوہ ماگھ کی کھیر، جسے ساری رات چھکے میں لٹکا کر رکھا گیا ہو؛ وہ تو ٹھنڈی ٹھار ہوتی ہوگی، اور یہاں ناول نگار کی طرف سے جس 'ڈش' کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے وہ تو گرما گرم بلکہ دھواں اٹھ رہا ہو، تب لطف دیتی ہے۔ اور پھر جب اسی بلاخیز عورت کے حسن سے بے زاری ہوئی تو کھٹی دہی کی ہمک بھی اسی حسینہ سے آنے لگی تھی۔ اسی طرح ایک اور جگہ ایک نسائی کردار کے نشیب و فراز کو بیان کرتے ہوئے شکر ملے میدے کو خمیر لگا کر بنائی جانے والی ڈولی کی روٹی کے ذکر و ذائقے کے ساتھ یکساں طور پر بیان ہو رہا ہے۔'... ماں نے تو لڑکیوں کے جسم کو خمیر چڑھنے کی بات بھی کی تھی۔ تو کیا کپڑے بدن کو خمیر چڑھنے کے سبب تنگ ہو جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سرین پر چلا گیا، ڈرتے لجاتے ہلکا سا دبایا تو وہ تازہ دھنکی ہوئی روئی سے بھرے ہوئے سرہانے جیسا لگا۔ اُسے ڈولی روٹی یاد آ گئی جسے بنانے کے لیے اُس کی اماں شکر ملے میدے کو خمیر کی جاگ لگا کر پہلے پھولنے کے لیے رکھ دیتی اور پھر اُن کی پھولی پھولی سی ڈولیاں گھی میں تل لیتی...'۔ ناول میں عورت کے حسن کو اتنے مختلف اور متنوع ذائقوں اور پیمانوں سے ناپنے کے باوجود عورت اور اس کا حسن دونوں محرومِ آرزو دکھائی دیتے ہیں۔ کیا عورت ایک ریاست کی علامت ہے؟ یا تاریخ بجائے خود تانیثیت کی دکان ہوا کرتی ہے؟ بظاہر تاریخ کی بے رخی کے مردانہ مظاہر بھی اس کی تانیثیت کو چھپانے میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔ اس عہد کی حسین عورت: جو اپنے اوپر متصرف کرداروں کی وجہ سے ہمیشہ اپنے حسن کی بلاخیزیوں سے ناآشنا رہتی ہے؟ کیا عورت اپنی اقلیم حسن و جمال کے کلید بردار، رازدار اور محافظ مرد کے لیے بھی بے سود رہتی ہے؟... مرد عورت کے لیے جیتا کم اور مرتا زیادہ ہے۔ مرد کے واسطے موت عورت ہی کا کوئی روپ ہے یا عورت ہی موت کا دوسرا نام، عورت جتنی حسین ہوگی، موت اُتنی ہی کریہہ اور اذیت ناک ہوگی۔ موت کبھی بدصورت عورت کا روپ نہیں دھارتی، ہمیشہ حسن کے تانیثی لبادے میں گھات لگا کر مارتی ہے۔ یہاں ناول دو طرفہ المِ نصیبی کا منظر پیش کر رہا ہے۔ ریاست کی خود رو کلیاں اور ریاست کے تناور درخت کیوں بہار کے موسم کا سامان نہیں بن سکے؟ شاید اس لیے کہ ریاست پر مسلط، متصرف یا قابض حکمرانوں کی نحوست رعایا کے لیے وبال اور حرماں نصیبی کے سامان پیدا کرتی رہتی ہے۔ ہم پاکستانی اپنے والیان ریاست یا حکمرانوں کے بیشتر اعمال و افعال کے رخ، جواز اور مآل کو سمجھ نہیں پاتے، وجہ یہ التباس ہے کہ شاید ہم ایک آزاد و خودمختار جمہوری ریاست ہیں۔ ہمیں شاید یہ ادراک نہیں ہے کہ ہم سرکارِ انگلشیہ سے وفاداری کے پیمان کے آج بھی اتنے ہی پابند ہیں، جتنی قبل از تقسیم کی بیشتر نام نہاد خودمختار ریاستیں تھیں۔ حفیظ خان کا ناول 'ہر ایک جنم کی جانما' یہی کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نواب فتح خان کی مسندنشینی کو بمشکل چار برس ہی ہوئے ہوں گے کہ شمالی ہندستان میں جنگ آزادی چھڑ گئی جسے سرکارِ انگلشیہ نے غدر کا نام دیا۔ قریب تھا کہ ہندستانی باشندے سلطنت انگلشیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں لیکن اس موقعے پر سرکارِ انگلشیہ کے بہی خواہوں نے ہر طریقے سے سرکار کی مدد کی۔ نہ صرف فوج دی بلکہ بے تحاشا مال و اسباب بھی فراہم کیے۔ پنجاب کے رئیسوں کی خدمات حد سے گزر چکیں تو سپرنٹنڈنٹ سرسہ کا خط نواب فتح خان کو ملا جس میں کچھ مقامات پر فوج کی تعیناتی کے بارے میں کہا گیا۔ اس کے بعد جان لارنس گورنر صاحب بہادر کا خط ملا کہ پانچ سو سوار اور پانچ سو پیادے سرسہ بھجوائے جائیں۔ نواب نے نہ صرف احکامات کی تعمیل کی بلکہ جب دلی کو سرکار نے تسخیر کر لیا تو اس خوشی میں احمد پور اور بہاول پور میں گھی کے چراغ جلائے گئے، توپیں سر ہوئیں اور مبارک بادی کا خریطہ گورنر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوا۔ یہ وہ نواب تھا جو انگریزوں کی ریاستی معاملات میں مداخلت کے باعث اپنے والد سے بغاوت کا مرتکب ہوا تھا۔ خلق خدا سے کچھ بھی اوجھل نہیں تھا۔ اقتدار کا لوبھ، تاریخ کے پنوں میں کالک کے طور پر محفوظ ہوا۔ شاید ہمارے خطے میں تاریخ کے پنوں میں محفوظ لوبھ اور لالچ تلف ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اگر کسی ریاست کا مدارالمہام اپنے شہریوں کے حقوق اور مفادات سے لاتعلق ہو کر؛ محض اپنے اقتدار کے دوام کی خاطر کسی بالادست قوت کے سایہ ہلاکت میں رہنے میں فخر محسوس کرتا ہے، اور اسی بنیاد پر وہ اپنے شہریوں کو انسان سمجھنے سے انکاری ہے، تو اسے یقین ہونا چاہیے کہ اس کا لوبھ اور لالچ تاریخ کے تاریک پنوں سمیت فنا ہو جائے گا۔

◆◆◆

مشہور شاعر اور نامور نغمہ نگار: کیفؔ بھوپالی

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور ادھوری اہم سعی 'مفہوم القرآن' ہے، جو منظوم ہے اور سولہ پاروں تک محدود ہے۔ کیفؔ کی ایک نہایت مقبول غزل کا مطلع عرض ہے:

تیرا چہرہ، کتنا سہانا لگتا ہے
تیرے آگے چاند پرانا لگتا ہے

اس لاجواب غزل کو مشہور گلوکار جگجیت سنگھ کی آواز نصیب ہوئی تھی اور کیفؔ کی شہرت میں مزید چار چاند لگ گئے تھے۔ قریب 74 برس کی عمر پا کر کیفؔ نے 24 جولائی، 1991 کو بھوپال ہی میں آخری سانس لی تھی۔ کیفؔ بھوپالی نہایت خوش مزاج، بذلہ سنج اور حاضر جواب شاعر تھے۔ اب وہ ہم میں نہیں ہیں، لیکن ان کی شاعری اور لاجواب نغمے آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ چلتے چلتے کیفؔ کی زندگی کے آخری دور کی ایک عمدہ غزل کا شعر حاضرِ خدمت ہے:

ایک کمی تھی تاج محل میں
میں نے تیری تصویر لگا دی

Jaweed Villa-Ground Floor
H. No. 12-2-419 / A / 3 / 1,
Alapati Nagar, Mehdipatnam,
Hyderabad-500028 (Telangana)

مسائلِ لغت وقواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

انھوں نے اس کی مناسبتِ بالائی کے اعتبار سے ملائی کے بجائے اس کا نام بالائی رکھ دیا۔ یہ تصرف اتنا عمدہ تھا کہ اہل لکھنؤ نے فی الفور اختیار کرلیا۔''[۵۶]

رشید صاحب کا مضمون 'لُغت اور استعمالِ عام' رسالہ 'اُردو ادب' مارچ 1957 میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ مضمون، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں 22 جون 1957، یکم جولائی 1957، 8 جولائی 1957، 15 جولائی 1957، 22 جولائی 1957، یکم اگست 1957، 8 اگست 1957، 15 اگست 1957، 22 اگست 1957، یکم ستمبر 1957 اور 8 ستمبر 1957 کے شماروں میں شائع ہوا۔ رشید صاحب کے اس مضمون پر ہفت روزہ ہماری زبان بابت 8 ستمبر 1957، صفحہ 9 میں آغا خلش کاشمیری کا تنقیدی مراسلہ شائع ہوا۔ اس مراسلے میں انھوں نے غیر ملفوظ حروف کو املا سے خارج کرنے کی تحریک میں بوالہوس کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ خلش صاحب نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ رشید صاحب نے مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے خیال کی آڑ لے کر 'ہوس' کو فارسی لفظ قرار دیا اور باقاعدہ عربی ترکیب کو ناجائز ٹھہرایا۔ اس مضمون میں رشید صاحب نے اُردو میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے بدلی ہوئی شکل کے لفظوں پر بحث کی ہے۔ موصوف کی نظر میں جن لفظوں کی شکل بدلی ان کے حرکات ومعانی میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس بارے میں رشید صاحب کا خیال ہے کہ ہر زبان کا مزاج اور لہجہ علاحدہ ہوتا ہے۔ اس لیے جو لہجہ اور کرختگی عربی اور فارسی کے لفظوں میں ہے وہ ہندوستانی جغرافیے کے تنوع کی وجہ سے موجود نہیں۔ انھوں نے اس بارے میں عربی لفظ 'عیاں' کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا کہ عربی میں عین پر کسرہ ہے اور وہاں کے لہجے کے اعتبار سے بجا ہے، لیکن اگر ہم یہ کسر عین پڑھیں تو لہجے میں عجیب غرابت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح انھوں نے فارسی لفظ فرشتہ کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا کہ اس کی فا پر زیر ہے۔ یہ فارسی کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن اُردو میں فا مکسور پڑھا جائے تو دہن بگڑنے کا احتمال ہوگا۔ رشید صاحب کا یہ بھی ماننا ہے کہ زبانیں پہلے وجود میں آتی ہیں اور قواعد ولغت کی کتابیں بعد میں مرتب کی جاتی ہیں۔ اکابرین نے بھی اس بارے میں یہی رائے پیش کی جو رائے رشید صاحب کی ہے۔ مولانا نظم طباطبائی اور مولانا الطاف حسین حالی نے اس ضمن میں اپنی آرا پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فارسی اور عربی کے بعض الفاظ اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ موصوف نے اپنے مضمون میں عربی وفارسی کے لاتعداد الفاظ کی فہرست شامل کی جن کا اُردو میں تلفظ تبدیل ہوگیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں عربی وفارسی کی تراکیب بہ طور مثال پیش کیں۔ اس مضمون میں رشید صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

> ''زبان پہلے بنتی ہے، قواعد ولُغت کی کتابیں بعد کو مرتّب کی جاتی ہیں۔ اس طرح اصولی طور پر ہونا یہ چاہیے کہ جو لفظ جس طرح بولا جاتا ہے اس کو اُسی طرح درج کیا جائے، لیکن اُردو لُغات میں ایسا نہیں ہے اور اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ہندستان میں جس وقت اُردو کی ابتدا ہوئی اُس وقت اور اس کے دنوں بعد تک یہ عالم رہا کہ عام طور پر لوگ السنۂ شرقیہ کے ماہر ہوتے تھے۔ آج خاص خاص لوگ ان کے متعلّق جتنی معلومات رکھتے ہیں اُس وقت کے عام پڑھے لکھے افراد ان سے زیادہ واقف ہوتے تھے۔ فارسی اور عربی چوں کہ 'مقدّس' زبانیں تھیں اور لوگ ان سے بڑی حد تک واقف ہوتے تھے لہٰذا اس بات کا بہ طورِ خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ عربی وفارسی الفاظ میں حتی الامکان قطع و برید نہ ہونے پائے۔ اُردو میں اساتذہ نے جو عطف واضافت مہنّد کرنا روا رکھا اس کی یہی وجہ تھی کہ لوگ بالعموم فارسی وعربی الفاظ کے تلفّظ، معانی اور صحیح اشتقاق سے واقف ہوتے تھے، اس لیے گفتگو اور تحریر میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔ اس لیے عام گفتگو میں الفاظ کا کتابی تلفّظ ہی قائم رہا۔
>
> دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مفرد الفاظ کی حرکات اور ان کے محلِّ استعمال کا فیصلہ عموماً لُغات کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ لُغات اساتذہ ومعتبرین کے کلام کو پیشِ نظر رکھ کر مرتّب کیے جاتے ہیں۔ اس طرح ہوتا یہ ہے کہ جن الفاظ کو اساتذہ نے جن حرکات کے ساتھ استعمال کیا ہے لُغت میں بھی ان کی وہی حرکات درج کردی جاتی ہیں۔ اُردو میں مدّت تک زبان و ادب کا مفہوم صرف نظم رہا۔ شعر میں لفظ کی حرکت کا تعیّن بالعموم قافیے میں کیا جاتا ہے (قافیہ کے علاوہ ساکن ومتحرک حروف کا تعیّن تو بعض اوقات شعر میں کسی دوسری جگہ ہو جاتا ہے لیکن زبر زیر کا تعیّن نہیں ہوسکتا) قافیے میں روی وماقبل روی کی حرکات محسوب ہوتی ہیں۔ اس طرح جو لفظ سہ حرفی و چہار حرفی یا اس سے زائد حروف سے مرکّب ہوتا ہے اس کے حروف اولین کی حرکات کا ضبط بحث سے خارج رہتا ہے۔ اس طرح ان الفاظ کے متعلّق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس حرکت کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔''[۵۷]

رشید حسن خاں نے حبیب احمد صدیقی کے مضمون 'ایطا' کے جواب میں بسیط مضمون 'ایطا کے بعض متعلقات' تحریر کیا۔ رشید صاحب کا یہ مضمون رسالہ سہ ماہی اُردو ادب، علی گڑھ، جون، 1957، صفحہ 104 تا 117 شائع ہوا۔ جب کہ حبیب احمد صدیقی کا مضمون رسالہ اُردو ادب بابت مارچ 1957 میں شائع ہوا۔ رشید صاحب کے مضمون کے بعد بھی حبیب صاحب کا مضمون جواب در جواب کی شکل میں رسالہ اُردو ادب بابت دسمبر 1957 میں شائع ہوا۔ دراصل حبیب صاحب نے رسالہ اُردو ادب بابت مارچ 1957 میں شائع ہوئے مضمون کی بنیاد بحر الفصاحت (نجم الغنی نجمی) میں شامل ایطا کے اصولوں کو بنایا۔ حبیب صاحب نے بحر الفصاحت سے ایطائے جلی کے متعلق جن مثالوں کو موضوعِ بحث بنایا ان میں (۱) پکے اور رلے (۲) باندھوں اور پہنوں (۳) بنواؤں اور سلواؤں (۴) ساعات مکانات (۵) کشوروں اور فقیروں (۶) ناچنا اور الاپنا (۷) خارزار اور لالہ (۸) بُت خانہ اور صاحب خانہ (۹) لپٹا اور رہتا (۱۰) خواہاں اور پویاں (۱۱) شہاں اور کہاں (۱۲) دانا اور پیدا (۱۳) شناسا اور نواسا وغیرہ شامل تھیں۔ انھوں نے مرزا غالب کا ایک خط بھی اس ضمن میں شاملِ مضمون کیا تھا جس میں غلامانہ، مستانہ، دلیرانہ، ترکانہ، شکرانہ وغیرہ میں ایطائے قبیح کا ہونا بتایا گیا تھا۔ رشید حسن خاں نے کلاسکی شعرا کے کلام سے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھا کہ بعض اساتذہ نے ایطا کی پابندی کی اور بعض نے پابندی نہیں کی۔ انھوں نے حبیب صاحب کی دی ہوئی ایطا کی تعریف 'ایطا کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ قافیے میں ایک جگہ مفرد لفظ آئے اور دوسری جگہ جمع ہو جیسے کارواں، دلبراں۔ جہاں ایسے قوافی آئیں گے وہاں ایطائے جلی واقع ہوگا:

بہت ہم نے دیکھے وزیر وشہاں
شکار ایسے دستور سے تھا کہاں (میرؔ)

شہاں، جمع ہے اور کہاں مفرد۔ لہٰذا ان دونوں قافیوں میں ایطائے جلی ہے'' پُرسخت اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ اصول اوّل تو ایطا کی تعریف کے اعتبار سے ہی غلط ہے۔ ایطا کی تعریف میں یہ بات شامل ہے کہ لفظ اور معناً تکرار ہو اور ایسے قوافی میں تکرار مفقود ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس اصول کو کبھی قابل التفات نہیں سمجھا گیا۔ حدائق البلاغت سے لے کر حسرت موہانی کی کتاب معائب سخن تک کسی میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ نیاز صاحب البتہ اس اصول کے قائل ہیں ان کی کتاب مالہ وماعلیہ دیکھیے متعدد جگہ سیماب، جگر وغیرہ پر یہ اعتراض ملے گا لیکن نیاز صاحب کی کافر طبیعتی سے سب واقف ہیں۔''[۵۸]

اپنے مضمون میں رشید صاحب نے حبیب احمد صدیقی کے مضمون سے درج ذیل شعر:

خبر ایسے میں کیا سوختہ سامانوں کی
شعلہ ہے شمع کا آغوش ہے پروانوں کی
ہر طرف بھی نہ ہو کس لیے دیوانوں کی
دشت وحشت میں نمایش وہ گریبانوں کی

نقل کر، اس پر اپنا مطمحِ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا:

> ''اُردو میں انسانوں اور ویرانوں کا قافیہ قطعاً جائز ہے۔ اساتذہ کے یہاں ایسے قوافی کثرت سے ملیں گے۔ صدیقی صاحب نے فرض کرلیا ہے کہ جو لفظ بہ حالت جمع آئے اس کو بصورت واحد تبدیل کر کے قریب شمار حرکت کیا جائے گا۔ حالاں کہ یہ درست نہیں۔ مندرجہ بالا اشعار کو لیجیے۔ سامانوں سے حروف زوائد نکالنے کے بعد سامان اور پروانوں سے علامات جمع نکالنے کے بعد پروان بچتا ہے جو اصل لفظ کے اعتبار سے بے معنی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک جگہ ایک لفظ بامعنی بچے اور ایک بے معنی تو ایطا نہیں ہوگا... اُردو میں قاعدہ یہ ہے کہ مطلع میں اگر ایسے قوافی آئے ہیں جن میں دونوں جگہ حروف زائد ہیں۔ تو اگر حروف زائد نکالنے کے بعد دونوں لفظ ہم قافیہ بچتے ہیں تو ایطا نہیں ہے اور قافیہ درست ہے۔ لیکن اگر دونوں ہم قافیہ نہیں ہوتے اور دونوں بامعنی لفظ بچتے ہیں تو ایطا ہے لیکن اگر ایک قافیہ بے معنی اور بامعنی بچتا ہے اور حرف روی قائم رہتا ہے تو ایطا نہیں ہوگا۔ اور وہ قافیہ جائز ہوگا۔ مثلاً اگر مطلع میں انسانوں اور پروانوں ہم قافیہ ہوں تو یہ قافیہ جائز ہے۔ کیوں کہ حروف زوائد نکالنے کے بعد انسان اور پروان بچتے ہیں۔ پروان بے معنی لفظ ہے۔ لہٰذا قافیہ درست ہے۔ ہاں اگر کسی شعر میں رفیقوں اور دوستوں ہم قافیہ ہوں تو ایطا ہوگا۔ کیوں کہ رفیق اور دوست ہم قافیہ نہیں ہوسکتے۔''[۵۹]

حواشی:

۵۴ ایضاً، ص 16۔
۵۵ رسالہ الحمرا، لاہور، نومبر 1952، ص 230۔
۵۶ رسالہ الحمرا، لاہور، اگست 1956، ص 81۔
۵۷ سہ ماہی اُردو ادب، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، جلد 5، نمبر 4، مارچ 1957، ص 6۔
۵۸ سہ ماہی اُردو ادب، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، جلد 6، نمبر 1، جون 1957، ص 107 -106۔
۵۹ ایضاً، ص 115-114۔

(باقی آئندہ)

مشہور شاعر اور نامور نغمہ نگار: کیفؔ بھوپالی

انجینئر محمود اقبال

کیفؔ بھوپالی ہندستان کے ایک مشہور شاعر اور فلمی نغمہ نگار ہیں۔ان کا نام خواجہ محمد ادریس ہے،لیکن کیفؔ بھوپالی کے نام سے شہرت پائی ہے۔وہ 20 فروری، 1917 کو بھوپال میں پیدا ہوئے تھے اور 24 جولائی، 1991 کو بھوپال ہی میں وفات پائی۔ان کو خاص طور پر فلم 'پاکیزہ' (1972) کے مشہور نغمے 'چلو دلدار چلو، چاند کے پار چلو' کی وجہ سے شہرت ملی۔ان کے آباواجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔کیفؔ بھوپالی مشاعروں کے مقبول ترین شعرا میں شامل تھے اور ان کا اندازِ ترنم بہت ہی دلنشیں تھا۔ان کی ایک مشہور طویل غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں
زندگی شاید اسی کا نام ہے
دوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں
ایک پیکر میں سمٹ کر رہ گئیں
خوبیاں، زیبائیاں، رعنائیاں
دیدہ و دانستہ اُس کے سامنے
لغزشیں، ناکامیاں، پسپائیاں
اُن سے مِل کے اور بھی کچھ بڑھ گئیں
اُلجھنیں، فِکریں، قیاس آراں
کیفؔ، پیدا کر سمندر کی طرح
وُسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

ان اشعار سے کیفؔ بھوپالی کے کلام کی گہرائی اور گیرائی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس پایہ کے شاعر تھے۔کیفؔ کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ کیفؔ کے آباواجداد کشمیر سے لکھنؤ اور عہد شاہجہانی میں لکھنؤ سے بھوپال آئے تھے۔کیفؔ بھوپالی کا سلسلہ نسب سلطان الہند خواجہ اجمیری کے پیر ومرشد حضرت خواجہ عثمانی ہارونی کے خانوادے سے ملتا ہے۔ کیفؔ بھوپالی کو شاعری کا فن وراثت میں ملا تھا۔کیفؔ کی والدہ صاحبہ صالحہ خانم عاجزؔ بھی منفرد لب و لہجے کی بہترین شاعرہ تھیں۔کیفؔ کی ابتدائی تعلیم وتربیت بھوپال ہی میں ہوئی۔کیفؔ اعلا تعلیم سے محروم تھے۔کیفؔ نے اردو، فارسی اور کلاسکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ان کے فن کو جلا بخشنے میں بھوپال کا ادبی ماحول، مشاعرے اور اہلِ علم کی صحبت کا بھی بڑا اثر رہا ہے۔کیفؔ نے اپنے ہم عصر شعرا میں اپنے منفرد لب و لہجے سے اردو شاعری میں اپنی الگ شناخت بنائی تھی اور 'شاعرِ فطرت' کہلائے۔ڈاکٹر بشیر بدر نے بھی میرٹھ سے نقلِ مکانی کرکے بھوپال ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی،اور وہیں داعیِ اجل کو لبیک بھی کہا تھا۔وہ کیفؔ بھوپالی کو اپنا بزرگ اور ممتاز شاعر مانتے تھے۔قومی وبین الاقوامی مشاعروں میں کیفؔ کی ملاقاتیں پاکستانی شاعروں احمد فرزاد اور شاعر وڈراما نویس امجد اسلام امجد سے بھی ہوتی رہی ہیں۔امجد اسلام امجد اپنے لاجواب ڈراما 'وارث' سے شہرت رکھتے ہیں۔کیفؔ بھوپالی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ان کی شاعری میں محبت، ہجر، انسان دوستی، سادگی اور کلاسکی اردو روایت کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔وہ مشاعروں کے نہایت مقبول شاعر تھے اور اپنے مخصوص ترنم سے سامعین کا دل موہ لیتے تھے۔ترنم سے یاد آیا، وہ مشاعروں کو اس طرح لوٹ لیتے تھے کہ سامعین کے مکرر، مکرر کی تکرار پر اپنا لہجہ اور ترنم مسکرا کر تھوڑا تھوڑا بدلتے رہتے تھے جس سے سامعین لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے، اور پھر، پھر وہی مکرّر مکرّر۔ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سامعین کے چہروں کو غور سے دیکھتے تھے، اگر کسی شعر پر بہت زیادہ داد ملنے لگتی تو پھر وہی شعر ترنم بدل بدل کر پڑھتے رہتے۔خود بھی مزے لیتے تھے اور سامعین کو کہتے تھے: ''لگتا ہے یہ شعر آپ کا ہوگیا، اب یہ میرا نہیں رہا''۔کیفؔ کا یہ نرالا پن، انھیں اپنے ساتھی شعرا سے منفرد اور ممتاز بناتا ہے، اسی لیے انھیں اکثر 'مشاعروں کا شاعر' بھی کہا جاتا ہے۔ان کی بیٹی پروین کیف نے اپنے والد محترم کی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے، جو بذات خود بھی ایک اچھی شاعرہ ہیں اور مشاعرے بھی پڑھتی ہیں اور لوٹتی بھی ہیں۔کیفؔ کے ساتھ ان کی ہونہار بیٹی کا بھی ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش ہے:

چاند سورج مرے گھر آتے ہیں
کیا حسیں خواب، نظر آتے ہیں

کیفؔ کے مشہور اشعار میں یہ شعر بہت معروف ہے:

کون آئے گا یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
میرا دروازہ ہواؤں نے ہلایا ہوگا

یہ غزل کیفؔ بھوپالی کی سب سے زیادہ مقبول غزلوں میں شمار ہوتی ہے، جسے بعد میں متعدد فنکاروں نے بھی اپنی شناخت کا ذریعہ بنایا تھا۔یہ اردو غزل کی بہترین تخلیقات میں شمار ہوتی ہے، جس سے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔اس غزل میں شاعر نے تنہائی، انتظار، جدائی، یادِ وطن اور زندگی کی بے ثباتی کو نہایت سادہ مگر پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔کیفؔ بھوپالی کی یہی سادگی ان کی شاعری کی نمایاں صفت ہے۔ یہ شعر اس احساسِ تنہائی کی تصویر ہے جب انسان کسی اپنے کا شدت سے منتظر ہو، لیکن دروازے پر سنائی دینے والی ہر آہٹ آخر کار، صرف ہوا ثابت ہو۔کیفؔ بھوپالی کو اردو شاعری اور فلمی نغمہ نگاری میں نمایاں خدمات کے لیے مختلف ادبی حلقوں میں بڑی قدر ومنزلت حاصل رہی۔ان کا کلام آج بھی مشاعروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور موسیقی کی محفلوں میں شوق سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔کیفؔ بھوپالی کے چند معروف اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ان کی شاعری میں سادگی، روانی اور دل کی کیفیت کا گہرا اظہار ملتا ہے:

داغ دنیا نے دیے، زخم زمانے سے ملے
ہم کو تحفے یہ تمھیں دوست بنانے سے ملے

حسن پر کیفؔ نے کیا کہا تھا؟ اور کیا خوب کہا تھا:

تجھے کون جانتا تھا، مری دوستی سے پہلے
ترا حسن کچھ نہیں تھا مری شاعری سے پہلے

کیفؔ بھوپالی نے فلم پاکیزہ کے لیے لازوال نغمے تحریر کیے تھے جن میں خاص طور پر 'چلو دلدار چلو، چاند کے پار چلو'...، 'تیرِ نظر دیکھیں گے'...، بہت مقبول ہوئے تھے اور آج بھی کلاسکی فلمی موسیقی کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔پاکیزہ کے ہدایت کار کمال امروہی تھے اور ان کی شریکِ حیات مینا کماری فلم کی ہیروئین اور ہیرو راج کمار تھے۔اس فلم کو بننے میں کم از کم چودہ سال لگے تھے۔موسیقی غلام محمد کی تھی، لیکن وہ فلم کی ریلیز سے پہلے ہی گزر گئے تھے۔بعد میں نوشاد نے پس پردہ موسیقی ترتیب دی تھی۔گلوکار تھے محمد رفیع اور لتا جی۔اسی فلم کا دوسرا گانا جو کیفؔ ہی کا ہے، 'تیرِ نظر دیکھیں گے...' کو بھی لتا جی کی مسحور کن آواز نصیب ہوئی تھی۔کیفؔ نے پاکیزہ کے علاوہ فلم 'رضیہ سلطان' (1983) کے نغمے بھی لکھے تھے اور خوب نام کمایا تھا۔'اے خدا شکر تیرا...' جس کی دُھن اور موسیقی خیّام نے ترتیب دی تھی۔کیفؔ نے اس کے علاوہ دو اور فلموں کے نغمے لکھے تھے اور امر ہوگئے۔'قسمت پلٹ کے دیکھ' (1961) اور 'شنکر حسین' (1977) شامل ہیں۔

کیفؔ بھوپالی کی شاعری کی اہم خصوصیات میں، سادہ اور عام فہم زبان، گہرے جذبات کا مختصر اظہار، محبت، ہجر اور تنہائی کے مضامین، مشاعرے کے انداز کی روانی اور دل میں اتر جانے والی تصویری کیفیات شامل ہیں۔کیف بھوپالی کے شعری مجموعوں میں، آہنگِ کیف، چاند کے پار، کوئے بتاں، شعلہ حرف اور حنا بہت معروف ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارہ کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***